GUMAN گمان
VOL 7, ISSUE 4, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

مرثیہ کی روایت میں دکن کا کردار

Dr. Azaadar Hussain*
E.S.T G.H.S. Sabowal, Sargodha
Dr. Tahir Hussain
G.H.S Radhan, Sargodha

Abstract

One of the reasons for the influx and concentration of Iranians in the Deccan was the trade from Iran to India. After the emergence of the Bahmani Empire, the Iranians who came here not only settled here, but also brought their own customs and culture. They brought along his beliefs, which included their attachment and devotion to Hazrat Imam Hussain, and which they must have been expressing in a covert manner, if not overtly. However, it can be said that in view of all these things, they may have started mourning ceremonies soon. From the study of the history of elegies, it is revealed that the practice of mourning and elegies started in the Deccan, if not before, certainly from the reign of Ahmad Shah Bahmani. When the Bahmani Empire fell, three kingdoms in particular got a chance to become independent. These included the states or kingdoms of Bijhapur, Ahmednagar and Golconda.

Key Words: Elegy, Iranians ,Bahmani Empire, Deccan

دکن میں مسلمانوں کی خود مختار سلطنت کا آغاز، علاؤالدین حسن گنگو بہمنی کی بادشاہت سے 1347ء میں ہوا۔ علاؤالدین بہمنی کا جانشین محمد شاہ انتہائی سمجھ دار تھا۔ امورِ سلطنت، شہری و فوجی تنظیم و ترتیب اور دربار سے متعلق قوانین اس عقل مندی سے مرتب کرتا کہ کچھ عرصہ ہی میں سلطنت کو اس قدر باوقار بنادیا کہ ہمسایہ ممالک کے لوگ اس کی طرف کھینچے چلے آتے تھے۔ خوش قسمتی سے علاؤالدین بہمنی کو اپنے بعد ایسا جانشین بھی ملا، جس نے اپنی فطری صلاحیت سے استحکام سلطنت کے ایسے طریقے اختیار کیے جنھوں نے بہمنی سلطنت کی بنیادیں دکن میں محفوظ کر دیں۔ شہری اور فوجی تنظیم، عہدے داروں کے فرائض واختیارات، دربار کے اصول وضوابط محمد شاہ نے ایسی دانش مندی سے مرتب کیے کہ ان پر عمل درآمد سے کچھ ہی عرصے میں بہمنی سلطنت کو ایک باوقار سلطنت کا درجہ حاصل ہو گیا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

> دربار کی شان وشوکت، قلعوں کی مضبوطی، فوجوں کی کثرت، اندرونی امن وامان دیکھ کر لوگ خود بہ خود دکن کی طرف کھینچنے لگے اور ہر طرح کے اہلِ کمال ملک دکن میں قدر ہنر کا شہرہ سن کر اس طرف متوجہ ہوئے۔ ان آنے والوں میں غزنی، کابل،

GUMAN گمان
VOL 7, ISSUE 4, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

ترکستان عراق اور ایران عرب سب ہی ملکوں کے باشندے ہوتے تھے۔ لیکن امورِ ملکی میں دخیل ہونے والوں میں ایرانیوں کی اکثریت تھی۔[1]

امورِ سلطنت میں ایرانیوں کی عمل دخل کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ حساب کتاب میں بہت تیز، ملکی امور میں مہارت کے حامل اور سپاہ گری میں چست و چالاک تھے۔ دکن میں ان ایرانیوں کی زیادہ تعداد میں آمد اور جمع ہونے کا ایک سبب ایران سے ہندوستان کی تجارت تھی۔ مسافروں کی آمد و رفت بھی مسلسل جاری رہتی تھی۔اس حوالے سے مسیح الزماں بیان کرتے ہیں کہ :

دکن میں اہلِ ایران کے زیادہ جمع ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ بہمنی عمل داری میں شروع ہی سے دابل اور گودا کا علاقہ بھی تھا جہاں سے جہاز کے ذریعہ ایران سے تجارت اور مسافروں کی آمد و رفت کا برابر سلسلہ رہتا تھا۔اور ایران سے ہندوستان آنے کا یہ راستہ درہ خیبر کے دشوار گزار راستے کے مقابلے میں آساں تھا۔[2]

دکن میں آنے والے ایرانی لوگ اپنی روایات، رواج، تہذیبی و ثقافتی رسوم، ایرانی معاشرت، ایرانی عقائد و معتقدات اور نظریہ حیات بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ پس یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ مقامی باشندوں نے ایرانی تہذیب و تمدن کو اپنایا اور ایرانی اعتقادات کے مطابق عزاداری شروع کی ہو گی۔ ایرانی باشندے جو دکن آئے تھے خاصے پڑھے لکھے اور ذہین تھے۔ یہ لوگ مدبرانہ سوچ کے حامل اور ملکی اُمور سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ علمی و ادبی محافل تک اپنا اثر و رسوخ قائم کر چکے تھے۔ام ہانی اشرف، سید عابد علی بلگرامی کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ :

اکثر ایشیائی سلطنتوں میں ایران کے باشندے، اپنے علم و فضل اور ذہانت و تدبر کی وجہ سے اعلا عہدوں پر فائز تھے اور سلاطین بہمنہ کے درباروں میں بھی شیعہ عمائدین کی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ مختصر یہ کہ ایرانی علما و فضلا کی خاصی تعداد دکن میں سکونت پذیر تھی اور وہ امورِ مملکت سے لے کر علمی ادبی محفلوں تک اپنا اثر و رسوخ قائم کر چکے تھے۔[3]

سلطنت بہمنی کے معرض وجود میں آنے کے بعد یہاں آنے والے ایرانیوں نے نہ صرف خود یہاں سکونت اختیار کی بلکہ اپنے رسوم و رواج اور تہذیب و تمدن بھی ساتھ لائے تھے۔ وہ اپنے اعتقادات جن میں حضرت امام حسینؑ کے ساتھ لگاؤ اور عقیدت کا جذبہ بھی شامل تھا، ہمراہ لائے اور جس کا واضح طور پر نہیں تو ڈھکے چھپے انداز میں اظہار بھی کرتے رہے ہوں گے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اِن تمام باتوں کے پیش نظر انھوں نے جلد ہی عزاداری کی محافل کا آغاز کر دیا ہو گا۔ محرم کے ابتدائی دنوں میں شہادت کا بیان بھی ہوتا ہو گا۔ پروفیسر مسیح الزماں اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ :

بہمنی سلطنت کا قیام آٹھویں صدی ہجری کا واقعہ ہے جو ایرانی یہاں پہنچتے تھے وہ اپنے ساتھ تہذیبی روایتیں، اپنے رسم و رواج، اپنے معتقدات و خیالات بھی لے کر آتے تھے۔ اس لیے ناممکن تھا کہ ان کے بعد جلد ہی یہاں عزاداری نہ شروع ہو گئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جب ان کی تعداد کم ہو یا ارد گرد کی فضا اس کی متقاضی ہو تو اسے زیادہ اعلان نہ دیا جاتا ہو لیکن ایرانیوں

GUMAN گمان
VOL 7, ISSUE 4, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

میں واقعات کربلا سے جو لگاؤ اور امام حسین سے جو عقیدت ہوتی ہے اس کی بنا پر یہ صورت ضرور ہوتی ہو گی کہ محرم سے پہلے عشرے میں کسی ایک جگہ بیٹھ کر شہادت کا بیان کرتے ہوں۔[4]

شہادت کے بیان کی حامل ان بیٹھکوں یا مجلسوں میں کن شعرا کا کلام پڑھا جاتا تھا اور پیش کی جانے والی تقاریر کس انداز کی ہوتی تھیں اس بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ تاریخ مرثیہ گوئی کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ پہلے نہیں تو یقیناً احمد شاہ بہمنی کے عہد سے دکن میں عزاداری اور مرثیہ گوئی کا رواج شروع ہوا۔ پروفیسر مسیح الزماں اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

ان مجالسوں میں کن شعرا کا کلام پڑھا جاتا تھا کس طرح کی تقاریر ہوتی تھیں ان کا کہیں سے پتہ نہیں چلتا۔ قیاس سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پرانے مقاتل پڑھنے والوں کے ساتھ لوگ اپنا زورِ طبیعت بھی دکھانے لگے ہوں گے تو عجب نہیں کیوں کہ دکن میں آنے والوں میں علما، فضلا اور شعرا کی بھی بہت بڑی تعداد تھی۔ سب سے پہلا تحریری ثبوت آذری کے یہاں ملتا ہے......آذری کی مرثیہ گوئی کا ذکر ہفت قلم، خزانہ عامرہ اور دوسرے تذکروں میں ملتا ہے۔ یہ بات اس کا ثبوت ہے کہ اگر اور پہلے سے نہیں تو احمد شاہ بہمنی کے عہد سے ضرور دکن میں عزاداری اور مرثیہ گوئی کا رواج ہوا۔[5]

بہمنی سلطنت جب زوال کا شکار ہو گئی تو تین ریاستوں کو بالخصوص خود مختار ہونے کا موقع ملا۔ ان میں بیجاپور، احمد نگر اور گول کنڈا کی ریاستیں یا حکومتیں شامل تھیں۔ ان حکومتوں کی داغ بیل ڈالنے میں ایرانی بھرپور انداز میں شامل تھے۔ ان ایرانی لوگوں میں سے کسی کی اپنے وطن ایران واپسی کی کوئی خواہش نہ تھی۔ انھوں نے یہاں شادیاں تک کر لی تھیں۔ وہ اس سرزمین کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ یہیں اپنی زندگی گزارنے لگ گئے۔ لہٰذا ان ایرانیوں کو غیر ملکی قرار دینا بجا نہ ہو گا۔ سلطنت گول کنڈا کا جلیل القدر حکمراں جو خود بھی شاعر اور مرثیہ گو تھا۔ بسنت کے حسین موسم میں دوشیزاؤں کے ہم راہ پھولوں کے جھرمٹ میں خوب صورت وسیع و عریض مرغزاروں میں چہل قدمی کرتا اور میلے کا سماں ہوتا۔ ''سیپ'' اشاعت خاص میں پروفیسر مسیح الزماں اردو مرثیے کی روایت عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:

بسنت کے پربہار موسم میں جب محمد قلی قطب شاہ اپنی نو بیلیوں کے ساتھ پھولوں کے انبار میں مسکراتا پھرتا تو قلعہ گول کنڈا سے متصل پر فضا تالاب اور وسیع مرغزاروں میں اس کی رعایا بھی میلہ لگا کر جشن میں حصہ لیتی تھی۔ جب یہی بادشاہ محرم کا چاند نکلتے ہی شیشہ و جام کو سلام کر کے سیاہ ماتمی لباس زیب بدن کر لیتا اور پاپیادہ عاشور خانہ کا رخ کرتا تو اس کی رعایا، جس میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اسی عقیدت سے اس کے ساتھ ہوتی۔[6]

بادشاہ کے ہمراہ اُس کی رعایا نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ ماتمی لباس پہن کر عزاداری کی رسمیں ادا کرتے تھے۔ بسنت جیسے تیوہار ہوں یا مراسم عزاداری، ہندو، مسلمان سب مل کر مناتے تھے۔ ان دنوں میں کوئی یہ نہیں سوچتا تھا کہ واقعہ کربلا کی یاد منانا صرف ایرانی شیعوں کی رسمیں ہیں

GUMAN گمان
VOL 7, ISSUE 4, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

بلکہ تمام مذاہب کے لوگ ان مراسم کی ادائی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ یہ تمام رسمیں اب اس سماج کی رسمیں بن چکی تھیں جن سے سب کی جذباتی وابستگی تھی۔ عزاداری کی ان رسموں نے مرثیہ کے لیے ایک خاص فضا تیار کی۔ لوگوں کی انفرادیت عقیدت اور فطری صلاحیتوں کے ملاپ سے اردو میں مرثیہ گوئی کا رواج ہو گیا۔ نصیر الدین ہاشمی مثنوی نوسرہار کو پہلا مرثیہ اور مصنف اشرف بیابانی کو اُردو کا پہلا مرثیہ گو قرار دیتے ہیں۔ جب کہ نصیر الدین ہاشمی ایک جگہ نوسرہار کو شہادت نامہ کہتے ہیں اور پھر دوسری جگہ اسے مرثیہ قرار دیتے ہیں۔ ان بیانات کے مطابق وہ خود شہادت نامہ اور مرثیہ کے بارے میں تذبذب کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ شاید وہ شہادت نامہ اور مرثیہ کو ایک ہی صنفِ سخن تسلیم کرتے ہیں۔ حالاں کہ ان دونوں اصنافِ سخن میں چند ایک مماثلتوں کے سوا واضح فرق پایا جاتا ہے۔ اس کے بر عکس مسیح الزماں اور رشید موسوی وجہی اور قلی قطب شاہ کو معاصر جانتے ہوئے ان کے یہاں دکنی اُردو مرثیے کے اولین نمونے پائے جانے کا انکشاف کرتے ہیں۔

بقول مسیح الزماں وجہی اور قلی قطب شاہ دونوں معاصرین ہیں۔ انھیں کے مرثیے، قدیم ترین موجود مرثیے ہیں۔ پروفیسر مسیح الزماں اس سلسلے میں ڈاکٹر رشید موسوی کا اقتباس پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

> ہاشمی صاحب لکھتے ہیں کہ نوسرہار ایک شہادت نامہ ہے اور پھر اسے وہ مرثیہ بھی بتاتے ہیں اور اسی بنا پر وہ اردو مرثیہ نگاری کی ابتدا کا شرف، شیخ اشرف کو بخشنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں مرثیہ اور شہادت نامہ دو الگ الگ اصناف ہیں یہ اور بات ہے کہ دونوں میں موضوع کے پہلو کچھ متحد ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہاشمی صاحب کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔[7]

وجہی اور محمد قلی قطب شاہ ہم عصر شعرا ہیں۔ دونوں مرثیے بھی لکھتے تھے۔ دونوں کے یہاں مرثیہ کے ابتدائی نقوش نمایاں ہیں چونکہ دونوں کا زمانہ ایک ہے اس لیے یہ طے کرنا کہ ان میں سے پہلے مرثیہ کس نے لکھا انتہائی مشکل ہے۔ اس بارے میں تاریخی شواہد خاموش ہیں۔ رشید موسوی کہتی ہیں کہ جو حضرات نوری کو دکن کا پہلا مرثیہ نگار قرار دیتے ہیں، درست نہیں کیونکہ نوری ابراہیم عادل بادشاہ کا درباری شاعر تھا۔ پس یقیناً اُس کا زمانہ ملا وجہی کے بعد کا ہے۔ سید عاشور کاظمی اردو مرثیے کا سفر میں اس حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ :

> ڈاکٹر موسوی نے سلطان قلی قطب شاہ اور ملا وجہی کے درمیان یہ طے کرنے میں دشواری محسوس کی ہے کہ دونوں میں پہلا مرثیہ گو کون تھا مگر تاریخ نے سلطان قلی قطب شاہ کو پہلا مرثیہ گو شاعر تسلیم کیا ہے۔[8]

محولہ بالا اقتباس کے مطابق رشید موسوی کے بر عکس عاشور کاظمی، سلطان قلی قطب شاہ کو اولین مرثیہ گو قرار دیتے ہیں۔ اس متعلق تاریخ کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔

عبدالرؤف عروج اردو مرثیہ کے پانچ سو سال میں محمد قلی قطب شاہ کو پہلا دکنی مرثیہ گو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

GUMAN
گمان
VOL 7, ISSUE 4, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

دکن کا سب سے پہلا قابلِ قدر مرثیہ گو خود وہاں کا فرماں روا محمد قلی قطب شاہ ہے۔اس نے جہاں بہت سی عشقیہ اور دعائیہ غزلیں لکھی ہیں وہاں وہ مرثیہ گوئی کے فن کی بھی آبیاری کرتا رہا۔اس کی مرثیہ گوئی نے اس دور کے تمام شاعروں کو متاثر کیا۔[9]

مذکورہ بالا بیان کے برعکس ڈاکٹر اسد اریب ملا وجہی کو سب سے قدیم مرثیہ گو تسلیم کرتے ہیں اور ثبوت کے طور پر وجہی کے مرثیہ سے اشعار بھی درج کرتے ہیں۔وہ اردو مرثیے کی سرگزشتمیں رقم طراز ہیں کہ :

بقول نصیر الدین ہاشمی اردو کا سب سے قدیم مرثیہ گو ملا وجہی ہے اس کے یہ اشعار بطور نمونہ ملتے ہیں۔

حسین کا غم کرد عزیزاں
انجوں نین سوں جھڑو عزیزاں

بنا جو اول ہوا ہے غم کا
عرش لگن رو ہر سمت ہلایا

بو کیا اندیشہ، اندیش کیتا
فلک شہاں پر ستم خدایا
حسین پو یاراں درود بھیجو
کہ دیں کا پوں دیا جلایا

تمہارے وجہی،کوں اماماں
نہیں تمن بن یو اس کو سایا[10]

ہندوستان میں مرثیہ سولھویں صدی میں پہنچا۔شروع شروع میں مرثیے قصیدے کی شکل میں اور مختصر ہوتے تھے۔بعد میں یہ مربع، مخمس اور بالآخر مسدس میں لکھا جانے لگا جو فی زمانہ شعرا کے ہاں مقبول صورت یا ہیئت ہے۔سید محمد عاشور کاظمی مرثیے کو مسدس ہیئت دینے کا سہرا سودا کے سر باندھتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ :

ہندوستان میں مرثیہ سولھویں صدی میں پہنچا۔ ابتدا میں مرثیے مختصر اور قصیدے کے روپ میں لکھے جاتے تھے اور بین مرثیے کا جزوِلازم تھا۔ بعد میں مرثیہ مربع، مخمس اور بالآخر مسدس میں لکھا جانے لگا۔ مرثیے کو مسدس میں لانے کا سہرا سودا کے سر باندھا گیا ہے۔ یہ ہیئت آج تک اپنائی جارہی ہے۔[11]

شروع میں شخصی مرثیے کہے جاتے تھے، لیکن بعد میں اردو مرثیہ کہنے والوں کو سید الشہدا امام حسینؑ اور کربلا میں اہلِ بیت کے ساتھ کیے گئے ظلم واستبداد کی ایک ایسی عظیم تاریخ مل گئی، جس کے انسانیت، اخلاقی اقدار اور دین سے اس قدر گہرے رشتے ہیں کہ اردو مرثیہ گو کو معمولی واقعات پر مرثیہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ زندگی کے ہر پہلو کی مثال کربلا میں مل جاتی ہے۔

جیسا کہ درج بالا سطور میں ذکر کیا گیا ہے کہ دکن میں مرثیے کے اولین نمونے وجہی اور محمد قلی قطب شاہ کے یہاں ملتے ہیں اور یہ دونوں شعرا ہم عصر بھی تھے۔ انھی کے مرثیے اردو کے قدیم ترین موجود مرثیے قرار پاتے ہیں۔ محرم کے سلسلے میں ہر سال سلطان محمد قلی قطب شاہ کئی مرثیے لکھتا تھا جو مختلف مواقع پر پڑھے بھی جاتے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کے پانچ مرثیے اس کے دیوان میں شامل ہیں۔ سلطنت گول کنڈا کے اس عظیم بادشاہ کو ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی دکن کا سب سے پہلا مرثیہ گو شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی مرثیہ گوئی سے اس دور کے تمام شاعر متاثر تھے۔ اس کے مرثیے غزل کے روپ میں ہونے کے ساتھ ساتھ سوز و گداز سے لبریز تھے۔

دکن میں گول کنڈا کی حکومت، شعرا، عالموں اور دیگر اربابِ فن کی سرپرستی کے سبب اپنی معاصر سلطنت عادل شاہی یعنی بیجاپور کی حریف تصور کی جاتی تھی۔ اور غالباً اسی کے ردعمل کے طور پر سلطنت بیجاپور کے افق پر بھی بے شمار خورشید آب وتاب کے ساتھ چمکنے لگے۔ دونوں حکومتیں عقائد کے لحاظ سے شیعہ مذہب سے وابستہ تھیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے بیشتر شعرا نے صرف مرثیہ گوئی کو ہی اپنا ذریعہ معاش سمجھا۔ بیجاپور سلطنت کے بادشاہ علم پرور، شاعر اور شعرا کے قدر دان تھے۔ عادل شاہی بادشاہوں نے شعر و شاعری کو فروغ دیا۔ بیجاپور کے عادل شاہی بادشاہوں نے بھی شاعری کو بہت ترقی دی۔ بیجاپور کا سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی شعر و شاعری میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ وہ مرثیے بھی کہتا تھا۔ سلطان علی عادل شاہ ثانی کا دور اردو مرثیہ کی ترقی کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اس کے عہد میں شاعروں نے بہ کثرت مرثیے لکھے۔ انقلابات زمانہ کی وجہ سے مرثیوں کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔ خود شاہی کے دیوان میں 16 مرثیے شامل ہیں۔ اس کے ہم عصر شعرا نصرتی، ملک خوشنود، ہاشمی، ایاغی، مومن، حسینی وغیرہ نے بھی مرثیے لکھے۔ مرزا اس دور کا بہت بڑا مرثیہ گو شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اس نے مرثیہ کے سوا کسی اور صنف سخن میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ مرزا نے دکنی مرثیے کے ابتدائی دور میں ہی اُردو مرثیہ کا معیار درست کر دیا۔ اس نے مرثیے میں نئے نئے پہلو اور زبان و بیان کی خوبیاں پیدا کیں۔ وہ پہلا مرثیہ گو ہے، جس نے شوکتِ الفاظ اور زورِ بیان سے مرثیہ کو ادبی حیثیت کے بلند مقام پر فائز کیا۔ مرثیہ گوئی مرزا کی گویا زندگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مرثیہ لکھتے لکھتے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ سید عاشور کاظمی مرزا کو عادل شاہی دور کا بڑا شاعر تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

قطب شاہی دور کے بعد عادل شاہی دور میں سب سے بڑا شاعر مرزا کو تسلیم کیا گیا ہے۔ مرزا کا عہد علی عادل شاہ ثانی کے عہد حکومت (1627۔1657ء) کے دوران بتایا گیا ہے جو قلی قطب شاہ سے نصف صدی بعد کا زمانہ ہے۔[12]

عادل شاہی دور میں برہان الدین جانم کا نام مرثیہ گوئی کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ بعض ناقدین اسے عادل شاہی دور کا پہلا مرثیہ نگار تسلیم کرتے ہیں۔ عادل شاہی دور حکومت میں علی عادل شاہ ثانی کے عہد کو مرثیہ نگاری کے عروج کا زمانہ شمار کیا جاتا ہے۔ علی عادل شاہ ثانی خود مرثیے کہتا تھا۔ اس کے اثنا یہ کلام سے عقیدت و دل چسپی کے باعث اُس دور کے کئی شاعر مرثیہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ نصرتی، مرزا، شاہ ملک، قادر اور انتہا آس دور کے اہم مرثیہ گو ہیں۔ اس عہد کا صاحبِ دیوان شاعر ہاشمی بھی مرثیے کہتا تھا۔ مرزا اس دور کے اہم مرثیہ گویوں میں نمایاں ہے۔

برہان الدین جانم کو بیجاپوری ادب کا سب سے پہلا مرثیہ گو اور مرزا کو بے جاپوری ادب کا اہم مرثیہ نگار شمار کیا جاتا ہے۔ بے جاپوری ادب میں مرثیہ نگاری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ام ہانی اشرف یوں رقم طراز ہیں:

> بیجاپوری ادب میں ہمیں سب سے پہلے برہان الدین جانم کے مرثیے دستیاب ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے والد ماجد میراں جی شمس العشاق کی وفات پر ایک مرثیہ کہا تھا۔ جانم کے اس مرثیے کا موضوع واقعات کربلا سے متعلق نہیں۔ بیجاپور کا یہ پہلا دستیاب شدہ مرثیہ غیر مذہبی نوعیت کا ہے۔ اس دور کا سب سے بلند پایہ مرثیہ نگار مرزا بیجاپوری ہے۔[13]

1686ء میں بیجاپور اور 1687ء میں گول کنڈا کی ریاستیں اورنگ زیب بادشاہ کے قبضہ میں آگئیں۔ قطب شاہی اور عادل شاہی دور کی ساری روایات اور تقاریب مکمل طور پر بند تو نہ ہوئیں مگر سابقہ ولولے اور جوش سے جاری بھی نہ رہیں۔ شاہی سرپرستی سے محرومی کے باعث درباروں سے وابستہ شعرا منتشر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں چند شعرا ہی منظر عام پر نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس بارے میں اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ میں لکھتے ہیں کہ:

> جب اورنگزیب نے ان سلطنتوں کو بیجاپور 1686ء گول کنڈا 1687ء ختم کر دیا تو بھی محرم اور اس سے وابستہ رسوم اسی ولولہ، جوش اور عقیدت و احترام سے منائی جاتی رہیں۔ ادھر مخصوص درباوں سے وابستہ شعرا نے بکھر کر کرناٹک، گجرات، برہان پور اور ملحقہ سلطنتوں میں بزم عزا کے انعقاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ بادشاہوں کے ساتھ ساتھ رعایا بھی اہلِ بیت سے عقیدت رکھتی تھی اس لیے مجلسوں وغیرہ کے لیے شعرا مرثیے لکھتے رہتے تھے۔[14]

اورنگ زیب بادشاہ نے بیجاپور اور گول کنڈا کو ختم کر دیا تو اس خاتمہ کے بعد بھی مراسم عزاداری انتہائی ولولے اور جوش و خروش سے ادا کی جاتی رہیں۔ مختلف ملحقہ سلطنتوں میں موجود شعرا نے عزا کی محافل کو عقیدت کے ساتھ جاری رکھا اور مراثی بھی کہتے رہے۔ اس دور کے اہم مرثیہ گو

شعرا میں ذوقی، بحری، اشرف، ندیم اور تبسم احمد ممتاز ہیں۔ بقول مسیح الزماں تبسم احمد کو تیم احمد لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر اسد اریب اس عہد کے اہم مرثیہ گو شعرا کے حوالے سے لکھتے ہوئے تبسم احمد کی جگہ یتیم احمد درج کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> اس دور میں ولی اردو شاعری کے باوا آدم نے خوب مرثیے لکھے۔ اسی دور میں ولی ویلوری یتیم احمد، اشرف ندیم بے جاپوری اور ذوقی وغیرہ مشہور ہوئے۔[15]

بے جاپوری سلطنت اور گول کنڈا کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد دکن پر مغل عمل داری کا آغاز ہوا۔ اور نگ زیب نے اور نگ آباد کو صدر مقام بنالیا۔ لہٰذا ادبی سر گرمیاں حیدر آباد سے نئے صدر مقام کی طرف منتقل ہو گئیں۔ یہاں کئی معروف مرثیہ نگاروں نے اپنی صلاحیتوں کا بھر پور اظہار کیا۔ 1687ء سے 1722ء تک دکن پر مغلوں کا تسلط قائم رہا۔ اس زمانے میں متعدد مشہور مرثیہ گو اور نگ آباد میں نظر آتے ہیں۔ ان میں سید شاہ حسین ذوقی، سید اشرف، شاہ ندیم، حسینی ندیم اور یتیم احمد وغیرہ بہت اہم ہیں۔ یہ تمام مرثیہ نگار صرف غزل اور قصیدہ کی شکل میں مرثیہ کہتے رہے۔ جب کہ یتیم احمد کے ہاں مربع کی شکل میں مرثیے ملتے ہیں۔ ان کا زمانہ تقریباً وہی ہے جو سودا کا زمانہ ہے۔

مغلیہ دورِ حکومت کا زوال اورنگزیب کی وفات کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ یہ عظیم الشان سلطنت ٹکڑوں میں منقسم ہو گئی۔ بااثر صوبے داروں نے سلطنت کے مختلف حصوں میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے حکومتیں قائم کر لیں۔ نتیجتاً آصف جاہی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ اس نئی حکومت نے بھی عزاداری اور مرثیہ خوانی کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی اس سلسلے میں یوں گویا ہوتے ہیں کہ:

> آصف جاہی سلطنت کے قیام کے بعد دکن میں مغلوں کا اثر و نفوذ ختم ہو گیا۔ اور یہاں مرثیہ خوانی کی قدیم روایات کے ساتھ نئی روائتیں بھی نشوونما پانے لگی۔ 1762ء تا 1803ء نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں ارسطو جاہ دیوان مقرر ہوئے۔ ان کی سرپرستی میں دکنی مرثیہ نگار نظر آتے ہیں۔ ان میں درگاہ قلی خاں درگاہ، ہمت علی خان ہمت کاظم علی خاں کاظم اور عباس علی خاں احسان کے نام قابل ذکر ہیں۔[16]

گویا آصف جاہی سلطنت میں مرثیہ گوئی کو خاطر خواہ فروغ دیا۔ یوں بہت سے مرثیہ گو شعرا سامنے آئے جنھوں نے اپنے فن اور تخلیقی صلاحیتوں کے استعمال سے مرثیہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا اور ان مرثیہ گو شعرا میں درگاہ قلی خاں دیگر بہت اہم ہیں۔ ان مرثیہ گویوں نے مربع، مخمس، مثلث اور بالخصوص مسدس میں مرثیہ خوانی کی۔ اورنگزیب کے بعد مغلیہ سلطنت زوال آمادہ ہو گئی۔ بااثر صوبے داروں نے خود مختاری اختیار کرنا شروع کر دی۔ دکن میں 1723ء کو آصف جاہی سلطنت قائم ہو گئی۔ اس دور کے دو اہم مرثیہ گو شعرا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ ہیں ہاشم علی اور درگاہ قلی خان۔ ہاشم علی کے عہد کے متعلق محققین میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ انھیں ہاشم علی گجراتی لکھا جاتا ہے۔ اسی اختلاف کی بنیاد پر گجراتی کہلانے کی ایک وجہ

GUMAN گُمان
VOL 7, ISSUE 4, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

یہ بتائی جاتی ہے کہ ہاشم نے ایک مرتبہ گجرات میں جا کر مرثیہ پڑھا تھا۔اس لیے انھیں گجراتی کہا جانے لگا۔در حقیقت یہ کمزور دلیل ہے کیونکہ کسی شاعر کا کسی علاقے میں مرثیہ پڑھنے سے وہ اس شہر کا باشندہ نہیں بن جاتا۔پس اس دلیل کی بنیاد پر انھیں گجراتی کہنا درست نہیں ہوگا۔

آصف جاہی دور میں مرثیہ کو خاصی ترقی ملی۔اس دور میں مرثیہ گویوں کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی کی گئی،جس کے باعث مرثیہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔مرثیہ میں مکالماتی انداز کا آغاز بھی اسی دور کا مرہونِ منت ہے۔ڈاکٹر اسد اریب دورِ آصفیہ میں مرثیہ گوئی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> عالم گیری تسلط کے بعد دورِ آصفیہ میں بھی مرثیے کی قدردانی کی گئی۔ہاشم علی و میر محمد قاسم اور امامی برہام پوری اس عہد کے کامیاب مرثیہ گو ہیں۔موجودہ مرثیہ کی تزئین میں امامی برہام پوری کا بہت ہاتھ ہے۔انھوں نے سب سے پہلے مرثیے میں مکالماتی رنگ کا آغاز کیا۔[17]

مرثیہ کی روایت سے واضح ہوتا ہے کہ اردو مرثیہ کا آغاز دکن سے ہوا ہے بلکہ مرثیہ کی داغ بیل اور ترقی میں دکن کے حکمرانوں اور تہذیب نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر مسیح الزماں،اردو مرثیے کا ارتقا (نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان 2002ء)،ص 17
2۔ ڈاکٹر مسیح الزماں،اردو مرثیے کا ارتقا،ص 18۔
3۔ ڈاکٹر ام ہانی اشرف،اردو مرثیہ نگاری،(علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس،س ن)،ص 43۔
4۔ ڈاکٹر مسیح الزماں،اردو مرثیے کا ارتقا،ص 27۔
5۔ ایضاً،ص 27،28۔
6۔ مسیح الزماں،ڈاکٹر،اردو مرثیے کی روایت،سیپ(1972ء)،ص 67۔68۔
7۔ مسیح الزماں،ڈاکٹر،اردو مرثیے کا ارتقا،42۔43۔
8۔ سید عاشور کاظمی،اردو مرثیے کا سفر،(دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،2006ء)،ص 45۔
9۔ عبدالرؤف عروج،اردو مرثیہ کے پانچ سو سال،(کراچی: شارق پبلی کیشنز،کراچی س ن)،ص 31۔
10۔ ڈاکٹر اسد اریب،اردو مرثیے کی سرگزشت،(لاہور: کاروان ادب،1989ء)،ص 98۔
11۔ سید عاشور کاظمی،اردو مرثیے کا سفر،ص 45۔46۔

12۔ سید عاشور کاظمی، اردو مرثیے کا سفر، ص50۔

13۔ ڈاکٹر ام ہانی اشرف، اردو مرثیہ نگاری، ص48۔

14۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2013ء) ، ص359۔

15۔ ڈاکٹر اسد اریب، اردو مرثیے کی سرگزشت، ص9۔

16۔ سید ضمیر اختر نقوی، اردو مرثیہ پاکستان میں، ص43۔

17۔ ڈاکٹر اسد اریب، نقد انیس، (لاہور: جدید بک ڈپو، 1967ء)، ص3۔